Research Journal
Tahqeeqat
جلد:5، شمارہ:1، 2026ء
eISSN: 2791-0342
pISSN: 2791-0334
ریسرچ جرنل
تحقیقات

پاکستانی اُردو افسانے میں سیاسی مزاحمتی رجحانات

Trends of Political Resistance in Pakistani Urdu Fiction

Abdul Rauf
PhD Scholar, Department of Urdu, Riphah International University, Faisalabad Campus
Email: abdulrauftabish@gmail.com
Dr. Jameel Asghar
Head of Department Urdu, Riphah International University, Faisalabad Campus

عبدالروف
پی ایچ۔ڈی اسکالر شعبہ اردو، رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی، فیصل آباد کیمپس
ڈاکٹر جمیل اصغر
صدر شعبہ اردو رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی، فیصل آباد کیمپس

Abstract

This research article explores the emergence and evolution of political resistance in Pakistani Urdu fiction, situating it within the traumatic historical context of the Partition of India in 1947. The Partition is examined not merely as a political event but as a profound civilizational rupture that reshaped identities, cultures, and collective consciousness. The resulting violence, displacement, and moral disintegration compelled Urdu fiction writers to transform narrative art into a vehicle of ethical inquiry and resistance. Through symbolic, allegorical, and psychological modes of expression, these writers articulated dissent against systemic oppression, social injustice, and ideological manipulation. The analysis highlights how prominent fiction writers employ narrative strategies to expose the brutality of power structures and the fragility of human values. Texts such as Toba Tek Singh and Anandi reveal the crisis of identity and the absurdity of political divisions, while other works foreground internalized fear, silence, and symbolic protest as forms of resistance. The study further examines how class conflict, feudal dominance, and postcolonial state formation contributed to a sustained tradition of literary resistance. Moreover, this research article underscores the role of gendered experiences, particularly the representation of women's suffering, as a critique of societal and political violence. The findings indicate that Pakistani Urdu fiction serves as a powerful medium of resistance, fostering critical consciousness, exposing injustice, and preserving collective memory. It not only reflects trauma but actively challenges oppressive structures, establishing literature as a vital force for socio-political awareness and humanistic resistance.

Keywords: *Political Resistance, Urdu Fiction, Partition of India, Trauma, Identity Crisis, Symbolism, Social Justice, Gendered Violence, Postcolonial Literature*

کلیدی الفاظ: سیاسی مزاحمت، اردو افسانہ، تقسیم ہند، نفسیاتی صدمہ، شناخت کا بحران، علامت نگاری، سماجی انصاف، صنفی تشدد، مابعد نو آبادیاتی ادب

تقسیمِ ہند فسادات اور مزاحمتی افسانوں کا پس منظر اردو ادب کے اس الم ناک باب سے وابستہ ہے جس نے نہ صرف برصغیر کی تہذیبی روح کو مجروح کیا بلکہ انسانیت کے اجتماعی ضمیر پر گہرے زخم ثبت کیے۔ 1947 کی تقسیم محض ایک سیاسی واقعہ نہیں تھی بلکہ یہ ایک تہذیبی سانحہ تھا جس نے نسلوں کے شعور زبان ثقافت اور احساسِ وابستگی کو چیر کر رکھ دیا اس سانحے نے جہاں لاکھوں انسانوں کو بے گھر اور بے وطن کیا وہیں ادیبوں شاعروں اور مفکروں کو اس سوال سے دوچار کر دیا کہ انسان آخر کب تک مذہب قومیت یا اقتدار کے نام پر خون بہاتا رہے گا تقسیم کے نتیجے میں

ابھرنے والے فسادات نے پورے خطے کو آگ و خون میں نہلا دیا اور اس اجتماعی المیے نے اردو افسانے کو ایک نیا مزاج نئی فکر اور نیا ضمیر عطا کیا۔ مزاحمتی ادب کی تخلیق دراصل اسی انسانی کرب اضطراب بیداری اور احتجاج کا نتیجہ تھی جس نے ادیب کو محض تماشائی نہیں بلکہ ضمیر کی آواز بننے پر مجبور کر دیا۔ پاکستانی اردو افسانے میں سیاسی مزاحمت ایک ہمہ جہت فکری اور ادبی رویے کے طور پر نمایاں ہوتی ہے جہاں افسانہ نگار اپنے عہد کی سیاسی ناہمواریوں جبر اور استحصالی نظام کے خلاف ایک بامعنی تخلیقی ردِ عمل پیش کرتا ہے۔ یہ مزاحمت براہِ راست نعرہ بازی کے بجائے علامت استعارہ اور تمثیل کے پیرائے میں جلوہ گر ہوتی ہے جس سے افسانہ محض بیانیہ نہیں رہتا بلکہ شعور کی بیداری کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ "ٹوبہ ٹیک سنگھ" میں افسانہ نگار نے تقسیم کے سیاسی المیے کو انسانی شناخت کے بحران سے جوڑ کر پیش کیا جب کہ "آنندی" میں سماجی و سیاسی نفاق کو طنزیہ انداز میں بے نقاب کیا گیا۔ اسی طرح "سفید فاختہ" اور "سہیم ظلمات" جیسے افسانوں میں داخلی خوف خاموشی اور علامتی احتجاج کے ذریعے جبر کے خلاف مزاحمت کو فکری سطح پر اجاگر کیا گیا ہے۔ ان افسانوں میں فرد محض ایک کردار نہیں بلکہ پورے عہد کی علامت بن جاتا ہے جو ریاستی دباؤ اور سماجی ناانصافی کے باوجود اپنی شناخت اور وقار کی بازیافت کی جدوجہد کرتا ہے۔ اس طرح اردو افسانہ سیاسی مزاحمت کو ایک سنجیدہ فکری و ادبی جہت عطا کرتے ہوئے قاری کو نہ صرف حالات کا ادراک دیتا ہے بلکہ اسے سوال اٹھانے اور حقیقت کو پہچاننے کی تحریک بھی فراہم کرتا ہے۔

قیامِ پاکستان کے پس منظر میں زمین دارانہ مفادات اور نو آبادیاتی ذہنیت کی باہمی سازش نے جس طبقاتی کشمکش کو جنم دیا وہ پاکستانی اردو افسانے میں ایک توانا سیاسی مزاحمتی شعور اور سیاسی مزاحمت کی صورت اختیار کر گئی۔ افسانہ نگار اس کو محض واقعاتی بیان تک محدود نہیں رکھتا بلکہ اسے استحصالی قوتوں کے خلاف ایک فکری احتجاج میں ڈھالتا ہے۔ زمین دارانہ جبر معاشی ناانصافی اور طبقاتی تفاوت کے خلاف ابھرنے والی یہ آواز کرداروں کی داخلی بے چینی اور سماجی شعور میں جھلکتی ہے۔ اس طرح افسانہ ایک ایسے تخلیقی بیانیے میں بدل جاتا ہے جو نہ صرف اقتدار کے غیر منصفانہ ڈھانچوں کو بے نقاب کرتا ہے بلکہ عوامی بیداری سیاسی مزاحمت اور انصاف کی جستجو کو بھی مہمیز دیتا ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

> "دولت اور اقتدار کے پجاری یہ جاگیر دار مسلمان عوام کی سیاسی بیداری اور مسلم لیگ کے منشور میں زرعی اصلاحات اور معاشی انصاف کے وعدوں سے خائف تھے۔ اس لیے الیکشن میں مسلم لیگ کی فتح مبین کے باوجود قیام پاکستان کو روکنے میں سرگرم عمل تھے۔"(1)

قیامِ پاکستان کے ابتدائی مراحل میں عوامی بیداری اور معاشی انصاف کے مطالبات نے ایک زبردست سیاسی مزاحمتی رجحان کو جنم دیا جو پاکستانی اردو افسانے میں بھرپور طور پر جھلکتا ہے۔ افسانہ نگار اس تاریخی تضاد کو محض واقعات تک محدود نہیں کرتا بلکہ اسے استحصالی قوتوں کے خلاف ایک فکری احتجاج اور مزاحمت میں ڈھالتا ہے۔ کرداروں کی داخلی بے چینی اور سماجی شعور اس سیاسی مزاحمت کو نہ صرف علامتی بلکہ عملی معنوں میں بھی اجاگر کرتا ہے۔

پاکستانی اردو افسانہ نگاری میں سیاسی مزاحمت کا رویہ ایک گہری فکری اور تخلیقی جہت کے طور پر نمایاں ہوتا ہے۔ یہ افسانے محض کہانی سنانے کا وسیلہ نہیں بلکہ اپنے عہد کی سیاسی بے انصافیوں سماجی جبر اور طاقت کے استحصالی ڈھانچوں کے خلاف ایک مؤثر ادبی احتجاج کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ افسانہ نگار اپنے حساس شعور اور باریک بین مشاہدے کے ذریعے معاشرے میں موجود تضادات ناانصافیوں اور طاقت کے غیر منصفانہ استعمال کو آشکار کرتے ہیں۔ ان کی تخلیقات میں فرد کی آزادی انسانی وقار اور اجتماعی شعور کی بازیافت کی ایک مضبوط آرزو جھلکتی ہے۔ اس طرح افسانہ ایک تخلیقی بیانیہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک فکری مزاحمت اور سماجی بیداری کی علامت بھی بن جاتا ہے۔ اس تناظر میں متعدد افسانہ

نگاروں نے اپنے فن کو سیاسی و سماجی شعور کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد، ممتاز مفتی، انتظار حسین، غلام عباس، بانو قدسیہ، منشایاد، احمد جاوید، مسعود اشعر، محمد حسن عسکری، جیلانی بانو، فہمیدہ ریاض، زاہدہ حنا، اور نورالہدیٰ شاہ جیسے ادیبوں کی تخلیقات میں اس مزاحمتی شعور کی گونج واضح طور پر سنائی دیتی ہے۔ ان کے افسانوں میں نہ صرف فرد کی داخلی کشمکش اور وجودی بحران کی عکاسی ہوتی ہے بلکہ سماجی و سیاسی جبر کے خلاف ایک دبیز اور معنی خیز احتجاج بھی موجود ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان تخلیق کاروں کی افسانہ نگاری اردو ادب کے بہترین اور معتبر افسانوی سرمایے میں شمار کی جاتی ہے۔ تقسیمِ ہند کے خون آشام پس منظر نے انسانی تاریخ کے ان بھیانک گوشوں کو بے نقاب کیا جہاں تہذیب کی ظاہری پرتیں یکسر منہدم ہو گئیں اور حیوانیت نے انسانیت کو روند ڈالا۔ اس اجتماعی صدمے نے پاکستانی اردو افسانے کو محض بیانیہ نہیں رہنے دیا بلکہ اسے ایک بیدار شعور کی مزاحمتی آواز میں ڈھال دیا۔ افسانہ نگار اس سفاک تجربے کو علامتی اور نفسیاتی سطح پر برتتے ہوئے جبر، تعصب اور طاقت کی اندھی حرکیات کے خلاف سوال اٹھاتا ہے۔ کردار اپنی ٹوٹی ہوئی شناخت اور داخلی کرب کے ذریعے اس تاریخی سانحے کی معنویت کو از سرِ نو دریافت کرتے ہیں۔ اس طرح افسانہ ایک سنجیدہ فکری احتجاج بن کر سامنے آتا ہے جو نہ صرف ماضی کی اذیت کو محفوظ کرتا ہے بلکہ قاری کے شعور میں مزاحمت کی چنگاری بھی روشن کرتا ہے۔۔ ذیل کا اقتباس اس کی واضح مثال ہے:

> ”عورتوں، لڑکیوں، بوڑھیوں، بیٹیوں، ماؤں، بہوؤں کی مادر زاد ننگی جماعت نکالی گئی۔ ان کے آگے پیچھے مردوں کی شور مچاتی اور ڈھول بجاتی ٹولی، اور بیچ میں ان ننگی عورتوں کی بھیڑ، عورتوں کے اندام نہانی میں نیزہ بھونکنے پر بہتے خون سے ان کی پیشانیوں پر نوا کھالی اور لاہور کا بدلہ لکھا گیا۔“(2)

افسانہ نگار کے خیال میں تقسیم کے المیے میں انسانی وقار کی پامالی نے تہذیبی شعور کو شدید صدمہ پہنچایا جس کی بازگشت پاکستانی اردو افسانے میں ایک گہری سیاسی مزاحمت کی صورت میں سنائی دیتی ہے۔ افسانہ نگار اس اندوہناک تجربے کو محض بیان نہیں کرتا بلکہ اسے جبر اور اجتماعی بے حسی کے خلاف فکری احتجاج میں ڈھالتا ہے۔ کرداروں کا داخلی کرب اس تاریخی سفاکی کے خلاف ایک خاموش مگر مؤثر مزاحمتی استعارہ بن جاتا ہے۔ سعادت حسن منٹو نے کسی سیاسی یا مذہبی بیانیے کے تحت نہیں بلکہ انسان کی بے بسی اور پاگل پن کے ذریعے مزاحمت کی۔ وہ اس نظامِ ظلم کے خلاف بولتے ہیں جو انسان کو مذہب سرحد یا قوم کے نام پر تقسیم کرتا ہے ان کے کردار فسادات کی آگ میں جلتے ہوئے دراصل ضمیر کی پکار بن جاتے ہیں ایک ایسی پکار جو اخلاقی شعور اور انسانیت کی بحالی کے لیے ناگزیر تھی کرشن چندر کے افسانے اس کے برعکس زیادہ سماجی اور علامتی سطح پر مزاحمتی حیثیت رکھتے ہیں ان کے ہاں تقسیم کے ساتھ ساتھ استحصالی نظام اور طاقت کے غلط استعمال کے خلاف احتجاج موجود ہے ”پشاور ایکسپریس“ جیسا افسانہ فسادات کے دوران انسان کے وحشی پن کو بے نقاب کرتا ہے مگر اس کے پسِ منظر میں انسان دوستی اور امن کی شدید تمنا بھی موجود ہے۔

تقسیمِ ہند کا سانحہ محض جغرافیائی تبدیلی نہ تھا بلکہ انسانی شعور اور تہذیبی اقدار کے شدید انہدام کا استعارہ بن کر ابھرا۔ اس کڑے تاریخی لمحے میں انسان کی باطنی تاریکیاں اس طرح عیاں ہوئیں کہ اخلاقی توازن متزلزل ہو گیا۔ یہی وہ پس منظر ہے جہاں پاکستانی اردو افسانے میں سیاسی مزاحمتی رجحان پوری شدت سے نمودار ہوتا ہے۔ افسانہ نگار اس انتشار کو محض واقعاتی سطح پر نہیں برتتا بلکہ اسے جبر بے معنویت اور طاقت کے غیر منصفانہ استعمال کے خلاف ایک فکری احتجاج میں ڈھالتا ہے۔ کردار اپنے داخلی کرب اور شکستہ شناخت کے ذریعے اس سوال کو ابھارتے ہیں کہ کیا تاریخ کا فیصلہ انسانی وقار سے بالا ہو سکتا ہے؟ اس طرح افسانہ ایک تخلیقی مزاحمت بن کر ابھرتا ہے جو قاری کو شعوری بیداری کی طرف مائل کرتا ہے۔

ڈاکٹر آصف فرخی لکھتے ہیں:

> ''تقسیم کے فوراً بعد انسانی فطرت اس طرح برہنہ سر سامنے آئی کہ خود انسان بھونچکا رہ گیا اور ادیب حیرت زدہ۔ "ظہورِ پاکستان تاریخی عوامل کا فطری نتیجہ تھا لیکن تقسیم کی روشنی میں نفرت اور منافرت کے جذبات اتنے تھے کہ تقسیم کے وقت تباہی کے مناظر دیکھ کر بہت سے ادیب ان عوامل کے ادراک میں کامیاب نہ ہو سکے اور انھیں اس تباہی سے زبردست دھچکا لگا۔''(3)

افسانہ نگار کے خیال میں تقسیم کے بعد کے المیے نے انسانی فطرت کی تہہ در تہہ تاریکیوں کو آشکار کیا جس نے ادیب کے شعور کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ یہی داخلی صدمہ پاکستانی اردو افسانے میں سیاسی مزاحمت کی صورت اختیار کرتا ہے جہاں افسانہ نگار محض بیان تک محدود نہیں رہتا بلکہ جبر نفرت اور تاریخی بے حسی کے خلاف ایک گہرا فکری احتجاج تخلیق کرتا ہے۔ افسانہ ''دھوپ'' میں ماضی کی یاد، اپنی سرزمین سے وابستگی اور شناخت کے احساس کو نہایت بلیغ انداز میں پیش کیا گیا ہے پاکستانی اردو افسانے کے تناظر میں یہ صورتِ حال سیاسی مزاحمت کی ایک لطیف اور فکری شکل اختیار کر لیتی ہے جہاں افسانہ نگار براہِ راست نعرہ بازی کے بجائے علامت استعارہ اور تہذیبی یادداشت کے وسیلے سے جبر بیگانگی اور سماجی ناہمواری کے خلاف اپنا احتجاج ثبت کرتا ہے۔ اس طرح ''دھوپ'' میں کرداروں کی داخلی کشمکش اور اپنی مٹی سے جذباتی وابستگی دراصل اس سیاسی و سماجی اضطراب کی علامت بن جاتی ہے جو فرد کو اپنے ہی وطن میں شناخت کی تلاش پر مجبور کر دیتا ہے، اور یہی کیفیت اردو افسانے میں مزاحمتی شعور کو ایک بامعنی ادبی و تحقیقی جہت عطا کرتی ہے۔ ڈاکٹر فردوس انور قاضی کی بصیرت کو سامنے رکھا جائے تو سعادت حسن منٹو کا افسانوی جہان محض فسادات کی روداد نہیں بلکہ ایک گہری سیاسی و سماجی مزاحمت کی علامت بن کر ابھرتا ہے۔ منٹو انسانی باطن کی ان پوشیدہ تاریکیوں کو بے نقاب کرتے ہیں جو جبر کے ادوار میں وقتی طور پر دب تو جاتی ہیں مگر مٹتی نہیں۔ خصوصاً تقسیمِ ہند کے ہنگاموں میں جب ریاستی و اخلاقی ضابطے ٹوٹتے ہیں تو اقتدار تشدد اور نفرت کے حقیقی چہرے سامنے آجاتے ہیں۔ منٹو کا افسانہ اسی مکروہ سچائی کے خلاف ایک فکری احتجاج ہے جہاں وہ منافقت کے پردے چاک کر کے انسان کو اس کی اصل صورت میں دکھاتے ہیں۔ یوں ان کی تخلیق سیاسی مزاحمت کا ایسا بیانیہ تشکیل دیتی ہے جو قاری کو محض آگاہ نہیں کرتا بلکہ اسے داخلی احتساب پر بھی آمادہ کرتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر فردوس انور قاضی لکھتی ہیں:

> ''منٹو نے فسادات پر متعدد افسانے لکھے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہو گی کہ منٹو کی نگاہیں فساد سے قبل بھی انسان کی چھپی ہوئی ذہنی غلاظتوں کو ڈھونڈ نکالتی تھیں۔ منٹو کو جھوٹے آدمیوں سے بیر تھا، جب 1947ء میں حادثاتِ وقت نے پابندیوں اور قانون کی ان زنجیروں کو توڑ ڈالا جو انسان کو مہذب بننے پر مجبور کرتی ہیں تو وہ 'مقدس' نقاب خود بخود چاک ہو گیا... جسے چاک کرنے کی کوشش منٹو کے افسانوں میں ہمیشہ موجود رہی جو معاشرے کے دبیز پردوں میں چھپے ہوئے خود آدمی کو دھوکا دے رہے تھے۔''(4)

افسانہ نگار کے کے زاویۂ نظر میں سعادت حسن منٹو کا بیانیہ محض فسادات نہیں بلکہ ایک تہہ دار سیاسی مزاحمت ہے جو تقسیمِ ہند کے پس منظر میں انسانی باطن کی سفاکی کو بے نقاب کرتا ہے۔ منٹو منافقت کے پردے چاک کر کے جبر کے خلاف فکری بیداری کو جنم دیتے ہیں۔ جہاں ماضی کی بازگشت اور زمین سے وابستگی دراصل ایک استحصالی نظام کے خلاف خاموش احتجاج بن جاتی ہے۔ کرداروں کی داخلی کشمکش محض ذاتی تجربہ نہیں بلکہ اس اجتماعی بے چینی کی علامت ہے جو جبر بیگانگی اور سیاسی ناہمواریوں سے جنم لیتی ہے۔ اس بیانیے میں علامت اور استعارہ کے ذریعے مزاحمت

کی ایک فکری جہت ابھرتی ہے جو براہِ راست نعرہ بازی کے بجائے تہذیبی یادداشت اور شعور کی سطح پر احتجاج کو منکشف کرتی ہے اور قاری کو سماجی وسیاسی حقائق پر غور پر آمادہ کرتی ہے۔

احمد جاوید کی تحریر "پیادے" ایک علامتی اور فکری متن ہے جو قاری کو بظاہر سادہ مگر باطن میں نہایت گہری معنویت سے آشنا کرتا ہے۔ یہاں "پیادہ" محض شطرنج کا مہرہ نہیں بلکہ وہ عام انسان ہے جو طاقت اقتدار اور چالاک ذہنوں کے کھیل میں سب سے پہلے قربان کیا جاتا ہے۔ افسانہ نگار اس علامت کے ذریعے جدید سماج کی اس بے رحم ساخت کو بے نقاب کرتے ہیں جہاں فیصلہ ساز محفوظ رہتے ہیں اور قیمت کمزور ادا کرتا ہے۔ تحریر کا منفرد پہلو یہ ہے کہ مزاحمت نعرے کی صورت میں نہیں آتی بلکہ ادراک کی سطح پر وقوع پذیر ہوتی ہے۔ پیادہ اپنے انجام سے واقف ہے مگر اسی آگہی میں اس کی عظمت پوشیدہ ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کا وجود وقتی ہے، لیکن کھیل کی معنویت اسی سے قائم ہے۔ ان کے نزدیک یہی شعور اصل بغاوت ہے اپنی حیثیت کو جاننا اور پھر بھی بیچ کے میدان میں قدم رکھنا۔ "پیادے" میں طاقت کے مراکز پر براہِ راست حملہ نہیں بلکہ قاری کے ضمیر پر دستک ہے۔ یہ تحریر بتاتی ہے کہ تاریخ کے بڑے بیانیے ہمیشہ پیادوں کے خون سے لکھے جاتے ہیں مگر یادداشت میں انہی کا نام مٹ جاتا ہے۔ افسانہ نگار اس گم شدہ نام کو فکر کی زبان عطا کرتے ہیں۔ "پیادے" ایک خاموش مگر گہری مزاحمت ہے جو جبر کے شور میں نہیں، شعور کی تنہائی میں جنم لیتی ہے۔ بقول احمد جاوید:

> "زمین اپنے اندر جھکی جاتی ہے اور میں سوچتا ہوں کہ عظیم تہذیبوں کو تو اس لیے زوال اتا ہے کہ تاریخ میں رقم ہو جائیں اور خوبصورت اور کشادہ شہر اس لیے زمین میں دھنستے ہیں کہ انے والوں کی تکریم کے لیے محفوظ ہو جائیں مگر میں جس کی گلیوں میں بھاگتا پھرتا ہوں وہ کیوں دھنستا جاتا ہے یہاں تو کوئی برج نہیں گنبد نہیں مینار نہیں۔"(5)

افسانہ نگار نے اس افسانے میں سیاسی مزاحمت ایک بالواسطہ مگر نہایت مؤثر صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے جہاں پیادہ استحصالی طاقتوں کے نظام میں عام انسان کی محکوم حیثیت کو نمایاں کرتا ہے۔ یہ افسانہ اقتدار کے کھیل میں کمزور طبقات کی قربانیوں کو آشکار کرتا ہے اور اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ فیصلہ ساز طبقات اپنی بقا کے لیے پیادوں کو قربان کرتے رہتے ہیں۔ محمد جمیل کے افسانے میں یہ غیر یقینی کیفیت اور یاثیت کا خوف پاکستانی اردو افسانوی مزاحمت کے اہم پہلوؤں کی نمائندگی کرتا ہے۔ افسانے میں ہر طرف عدم اطمینان کی فضا فرد کے شعور اور سماجی ماحول کو متاثر کرتی ہے اور یہ غیر یقینی صورتحال مزاحمتی رجحانات کی فکری بنیاد بنتی ہے۔ کردار یہ نہیں جانتے کہ اگلے لمحے کیا ہو گا اور کون کس کی زندگی پر اثر انداز ہو رہا ہے، لیکن اس خوف اور دہشت کے باوجود وہ اپنی شناخت اور انسانی وقار کے تحفظ کی جدوجہد جاری رکھتے ہیں۔ افسانہ یہ شعور دیتا ہے کہ خوف عدم تحفظ اور سیاسی یا سماجی دباؤ کے باوجود انسانی مزاحمت جاری رہتی ہے اور یہ قومی اخلاقی اور انسانی وقار کے تحفظ کی علامت ہے۔ پاکستانی اردو افسانوی ادب میں مزاحمت کے فکری ادبی اور سماجی پہلوؤں کو مستند اور جامع انداز میں پیش کرتا ہے۔ اس ضمن میں یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> "کئی روز سے علاقے کی فضا پر ایک بے نام سے سوگواری چھائی ہوئی تھی ہر چہرہ بے رونق تھا اور آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں تھیں انسان تو انسان جانوروں پر بھی اس گھمبیر تا کا اثر تھا پرندے جیسے چہچہانا بھول گئے تھے گاؤں کے کتے بھی کونوں وکھدروں میں چھپ گئے تھے۔"(6)

پاکستانی اردو افسانے میں سیاسی مزاحمتی رجحان کو سمجھنے کے لیے اس داخلی کرب اور اخلاقی اضطراب کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو انسانی تاریخ کے پر تشدد ادوار نے جنم دیا۔ اس تناظر میں افسانہ نگار محض واقعاتی بیانیہ پیش نہیں کرتا بلکہ انسانی باطن کی تہوں میں اتر کر اس سوال کو ابھارتا ہے کہ

انسان اپنی ہی نوع کے خلاف اس قدر سفاک کیسے ہو جاتا ہے۔ یہی جستجو افسانے کو مزاحمت کی ایک بامعنی صورت عطا کرتی ہے جہاں ظلم کی عکاسی کے ساتھ ساتھ انسانیت کے باقی ماندہ نقوش کو بھی نمایاں کیا جاتا ہے۔ اس طرزِ اظہار میں کرب شرمندگی اور داخلی احتساب مل کر ایک ایسا فکری زاویہ تشکیل دیتے ہیں جو قاری کو محض تماشائی نہیں رہنے دیتا بلکہ اسے اخلاقی شعور اور ذمہ داری کے احساس سے ہمکنار کرتا ہے۔ خود منٹو اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "میں نے اس خون کے سمندر میں غوطہ لگایا جو انسان نے انسان کی رگوں میں بہایا تھا اور چند موتی چن کر لایا، عرقِ انفعال کے، مشقت کے، جو اس نے اپنے بھائی کے خون کا آخری قطرہ بہانے میں صرف کی تھی۔ ان آنسوؤں کے جو اس جھنجھلاہٹ میں کچھ افسانوں کی آنکھوں سے نکلے تھے۔ وہ اپنی انسانیت کیوں ختم نہیں کر سکے۔۔۔ یہ موتی میں نے اپنی کتاب 'سیاہ حاشیہ' میں پیش کیے۔"(7)

منٹو کے افسانے پاکستانی اردو افسانے میں سیاسی مزاحمت کی ایک درخشاں مثال ہیں جہاں انسانی خونریز تاریخ کے پس منظر میں ضمیر کی بیداری کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ان کے ہاں انسان کی داخلی شکست کرب اور اخلاقی زوال کو بے نقاب کرتے ہوئے اس حقیقت کو اجاگر کیا جاتا ہے کہ شدید ترین ظلم کے باوجود انسان کے اندر انسانیت کی ایک رمق باقی رہتی ہے جو مزاحمت کی بنیاد بنتی ہے۔ غلام عباس کے افسانہ انندی اور "اوور کوٹ" میں سماجی مزاحمت طنز و استعارہ کے نہایت مؤثر امتزاج کے ذریعے ابھرتی ہے جہاں مذہبی ریاکاری طبقاتی جبر اور طاقت کے استحصالی رویوں کو باریک طنزیہ اسلوب میں بے نقاب کیا گیا ہے۔ یہ افسانے قاری کو محض تفریح نہیں دیتے بلکہ ایک فکری جھٹکا فراہم کرتے ہیں جو سماجی نظام کی کھوکھلی بنیادوں کو آشکار کرتا ہے۔

احمد داؤد کا افسانہ "شہید" اردو مزاحمتی ادب کی ایک سنجیدہ اور فکری مثال ہے جس میں مزاحمت کو محض سیاسی نعرے یا وقتی ردِ عمل کے بجائے ایک شعوری اور اخلاقی عمل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ کہانی کا سیاق و سباق ایک ایسے جبر زدہ سماج سے وابستہ ہے جہاں ریاستی طاقت خوف اور خاموشی معمول بن چکے ہیں اور سچ بولنا جرم تصور کیا جاتا ہے۔ اسی فضا میں افسانہ فرد اور طاقت کے تصادم کو داخلی اور علامتی سطح پر بیان کرتا ہے۔ افسانے کی کہانی ایک ایسے نوجوان کے گرد گھومتی ہے جو ظلم اور ناانصافی کے خلاف کھڑا ہونے کا حوصلہ رکھتا ہے وہ کسی عسکری ہیرو کے بجائے ایک عام انسان ہے جس کی سادہ زندگی اور حساس شعور اسے مزاحمت کی طرف لے آتا ہے۔ اس کا "شہید" ہونا صرف جسمانی موت نہیں بلکہ ایک نظریاتی اعلان ہے جو جابر نظام کے اخلاقی زوال کو بے نقاب کرتا ہے۔ افسانے میں ماں ساتھی اور جابر قوت کے نمائندہ کردار شامل ہیں جو سماج کے مختلف رویّوں کی علامت بنتے ہیں۔ بقول احمد داؤد:

> "باہر گلی میں رات اپنے جوبن پر تھی چاند کی پندرہویں تھی اور ہم تھے پھر ایک پر سرار مشکوک سناٹا اسے میں نے اپنے ساتھ ایسے لپٹا رکھا تھا ہمارا سایہ ایک اکائی بن گیا تھا چاند کی روشنی میں اپنے قدموں کے پاس یہ سائے کو دیکھ کر یوں لگا جیسے میں نے اسے اوڑ لیا ہے وہ میرے وجود کی تابوت میں ایک لاش کی طرح فٹ آ گیا ہے پتہ نہیں کس طرح وہ مجھ سے جڑا گھسٹ گھسٹ کر چل رہا تھا۔"(8)

مزاحمتی ادب کی اساس اس فکری جرأت میں مضمر ہے جو مظلوم کو اظہار کی توانائی عطا کرتی ہے اور تاریخ کے دبے ہوئے بیانیوں کو زندہ کرتی ہے۔ افسانہ نگار کے اس افسانے میں سیاسی مزاحمت ایک شعوری و اخلاقی رویّے کے طور پر جلوہ گر ہوتی ہے جہاں فرد جبر کے مہیب نظام کے مقابل سچ اور ضمیر کی قوت سے برسرِ پیکار دکھائی دیتا ہے۔ یہ افسانہ واضح کرتا ہے کہ حقیقی مزاحمت محض خارجی تصادم نہیں بلکہ داخلی استقامت

اخلاقی بیداری اور انسانی وقار کے تحفظ کا ایک ہمہ گیر عمل ہے۔ سائے کا وجود کے ساتھ چپک جانا اور لاش کی طرح گھسٹتے ہوئے ساتھ چلنا دراصل موت کے شعور اور شہادت کے احساس کی علامت ہے۔ افسانہ "شہید" میں یہی کیفیت مزاحمتی ادب کی اساس بنتی ہے جہاں کردار اپنی موت سے خوف زدہ نہیں بلکہ اسے اپنے وجود کا حصہ تسلیم کر لیتا ہے۔

پاکستانی اردو افسانے میں سیاسی جبر کے خلاف مزاحمت دراصل اس سماجی و فکری بیداری کی علامت ہے جو ادب کو محض تفریح یا بیانیے کے درجے سے نکال کر انسانی ضمیر اور اجتماعی شعور کی نمائندگی بناتی ہے قیامِ پاکستان کے فوراً بعد جہاں قوم ایک نئی ریاستی شناخت کے حصول میں مصروف تھی وہیں اقتدار طبقاتی مفادات آمریت اور نظریاتی استحصال کے اندھیرے بھی اپنے قدم جما رہے تھے اختر جمال کا افسانہ "سالگرہ کا کیک" اردو مزاحمتی ادب میں ایک علامتی اور فکری اہمیت رکھتا ہے جہاں روزمرہ زندگی کی ایک سادہ تقریب جبر محرومی اور سماجی ناہمواری کے خلاف خاموش احتجاج میں ڈھل جاتی ہے۔ بقول اختر جمال:

> "میرے سامنے سلاخوں کی دوسری جانب ایک انیس سالہ لڑکا ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنے کھڑا تھا اس کی آنکھوں میں چراغوں کی جوت تھی اور اس کی آنکھوں سے اس کی بوڑھی ماں اپنے بجھتی ہوئی آنکھوں کی شمعیں منور کرنے آئی ہے ماں کی آنکھوں سے مسلسل پانی بہہ رہا تھا اس کے قریب ایک قیدی جس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی نہ تھی اپنے ہاتھ سلاخوں سے باہر نکالتے ہی اپنی چار سالہ ننھی بچی کو ہاتھوں میں اٹھائے کھڑا تھا بچی نے اپنا ننھا سا خوبصورت چہرہ سلاخوں سے لگا رکھا تھا اور سلاخوں کو دوسری جانب اس کے باپ کے ہونٹ تھے وہ اسے شدت سے چوم رہا تھا میری بیٹی کو تکلیف نہ ہونے دینا اس کا دودھ بند نہ کرنا سنا ہے ڈبے مہنگے ہو گئے ہیں؟"(9)

افسانہ نگار نے اس افسانہ میں یہ مزاحمت علامتی پیرائے میں جلوہ گر ہے جہاں معمولی خوشی بھی طبقاتی جبر اور معاشی ناہمواری کا استعارہ بن جاتی ہے۔ کرداروں کی خاموش کشمکش اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ مزاحمت نعرہ نہیں بلکہ داخلی کرب اخلاقی آگہی اور انسانی وقار کے تحفظ کی ایک سنجیدہ اور شعوری جدوجہد ہے۔ افسانہ نگار جیل کے ماحول میں انسانی المیے اور سماجی جبر کی ایک نہایت دردناک تصویر پیش کرتے ہے جہاں سلاخیں صرف جسمانی قید کی علامت نہیں بلکہ رشتوں جذبات اور امیدوں کے بیچ حائل بے رحم نظام کی نمائندگی کرتی ہیں۔ انیس سالہ نوجوان کی آنکھوں میں موجود روشنی مستقبل اور زندگی کی علامت ہے جب کہ اس کی بوڑھی ماں کی آنکھوں سے بہتا ہوا پانی ایک ایسی نسل کے دکھ کو ظاہر کرتا ہے جو اپنی اولاد کو جبر کی نذر ہوتے دیکھ رہی ہے۔ دوسری جانب قیدی باپ اور چار سالہ بچی کا منظر اس نظام کی سفاکی کو مزید واضح کرتا ہے جہاں معصوم بچپن سلاخوں کے درمیان پروان چڑھنے پر مجبور ہے۔ باپ کے الفاظ دودھ مہنگائی اور بچی کی تکلیف اس بات کی علامت ہیں کہ جبر صرف آزادی نہیں چھینتا بلکہ بنیادی انسانی ضروریات کو بھی غیر محفوظ بنا دیتا ہے۔

پاکستانی اردو افسانے میں سیاسی مزاحمتی رجحان اس وقت زیادہ شدت کے ساتھ ابھرتا ہے جب انسانی جبلت کی تاریک ترین صورتیں سماجی اور مذہبی نقابوں کو چاک کر دیتی ہیں۔ فسادات کے پس منظر میں عورت کا استحصال محض ایک فرد کا المیہ نہیں بلکہ پورے معاشرتی اور اخلاقی زوال کی علامت بن کر سامنے آتا ہے۔ افسانہ نگار اس صورتِ حال کو بیان کرتے ہوئے محض منظر نگاری نہیں کرتا بلکہ انسانی ضمیر کو جھنجھوڑنے کا فریضہ انجام دیتا ہے اس طرح یہ افسانے سیاسی اور سماجی ڈھانچوں کی شکست کو بے نقاب کرتے ہوئے انسانی وقار کی بازیافت کی جدوجہد کو معنویت عطا کرتے ہیں۔

اس حوالے سے اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''جب کبھی مرد کو وہ دیواریں گرانے کا موقع ملا جو سماجی یا مذہبی قوانین نے عورت کے گرد بنا رکھی ہیں تو عورت بالعموم اسی قسم کے المیہ سے دوچار ہوئی۔ فسادات میں اس قسم کے مواقع مرد کو خوب ملے۔ دلشاد عورت کی مظلومیت کی ایک زندہ کہانی بن کر 'یا خدا' میں ابھرتی ہے جسے غیروں نے تو اس لیے لوٹا کہ وہ غیر تھی اور اپنوں نے اس لیے لوٹا کہ وہ بے سہارا تھی۔ فساد تو ایک بہانہ تھا ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ دونوں ملک ان مردوں کے تھے جنھوں نے شرافت کے نقلی پردے پھاڑ کر محض عورت کے ننگے جسم کے گرد ناچنا شروع کر دیا۔''(10)

افسانہ نگار نے فسادات کے پس منظر میں عورت پر ہونے والے جبر کو اردو افسانے میں محض المیہ کے طور پر ہی نہیں بلکہ ایک گہرا مزاحمتی شعور بنا کر پیش کیا ہے جہاں افسانہ نگار انسانی درندگی کو بے نقاب کرتے ہوئے ضمیر کی بیداری کو جنم دیتا ہے۔ اردو افسانے کی مزاحمتی روح کو سب سے پہلے احمد ندیم قاسمی نے اپنے نرم لیکن پُراثر بیانیے میں اجاگر کیا ان کے افسانے ''گنڈاسا''، ''کپاس کا پھول'' اور بازگشت میں سماجی ظلم اور سیاسی منافقت کے خلاف احتجاج چھپا ہوا ہے وہ براہِ راست شور نہیں مچاتے بلکہ انسانی کردار کے ذریعے ظلم کی داخلی گہرائی دکھاتے ہیں۔ ضیاء الحق کے دورِ آمریت میں ادبی مزاحمت نے ایک نیا رنگ اختیار کیا زاہدہ حنا کے افسانے دربدر ''نیلی بارش'' اور ''ہجرتوں کے درمیان'' میں جبر کے خلاف انسانی وقار کی جدوجہد نمایاں ہے ان کے ہاں عورت کی آواز دراصل پورے معاشرتی نظام کے خلاف احتجاج بن جاتی ہے وہ عورت کو مظلوم کے طور پر نہیں بلکہ احتجاجی ضمیر کے طور پر پیش کرتی ہیں جو ریاستی اور سماجی دونوں جبر کے خلاف کھڑی ہوتی ہے جیلانی بانو کے افسانے نئی عورت اور بارش کی دعا بھی اسی سیاسی و معاشرتی استحصال کے خلاف مزاحمت کا استعارہ ہیں۔

مزاحمتی علامت نگاری بعد میں غلام عباس مستنصر حسین تارڑ اور رشید امجد کے ہاں مزید پختگی کے ساتھ ابھرتی ہے رشید امجد کے افسانے ''سفید فاختہ اور آدمی'' میں فرد کے اندر کا خوف اور خاموشی سیاسی جبر کے خلاف علامتی احتجاج بن جاتی ہے وہ بتاتے ہیں کہ جب نظام ظلم سے بھرا ہو تو خاموش رہنا بھی ایک طرح کی بغاوت ہے۔ ریاست کی جبریت طبقاتی ظلم اور انسانی حقوق کی پامالی ادیب کے دماغ میں مسلسل فکری اور اخلاقی کشمکش پیدا کرتی ہے جو افسانوی مزاحمت کی بنیاد بنتی ہے۔ پاکستانی افسانہ نگار ان مظالم اور جبر کو اپنی تحریر میں اجاگر کرتے ہوئے قارئین کو اجتماعی شعور انصاف اور انسانی وقار کی اہمیت سے روشناس کرواتے ہیں جو پاکستانی معاشرتی اور سیاسی حقیقتوں کے آئینے میں انسانی وقار اور آزادی کا پیغام دیتی ہے۔ بقول اعجاز راہی:

> ''میں فن کو منجمد شے نہیں سمجھتا فن اور اس کی قدریں زمانی اور مکانی صورتحال سے تبدیل ہوتی ہیں اگر معصوم جسموں پر پڑنے والے کوڑوں کی ظالمانہ آوازیں ادیب کے احساسات کو مجروح نہیں کرتیں تو ادب ٹھہرے ہوئے گندے پانی کی کائی زدہ جوہڑ سے بدتر ہے جس سے کتا بھی پانی پینا پسند نہیں کرتا میں یہ بات واضح کر دوں کہ ادیب کو سلطان یا سلطنت سے کوئی عناد نہیں ہوتا لیکن ریاست پر ظالمانہ طبقاتی نظام کی چاپ اس کے جذبات و احساسات پر قطرہ قطرہ تیزاب کی طرح گرتی رہتی ہے چنانچہ اس کے قلم کے نظام کی جبریت کے خلاف احتجاج جنم لینے لگتا ہے''(11)

پاکستانی اردو افسانے میں سیاسی مزاحمتی رجحان کو سمجھنے کے لیے تقسیم کے بعد پیدا ہونے والی تہذیبی شکست جغرافیائی تقسیم اور داخلی خلا کو نظر میں رکھنا ناگزیر ہے۔ یہی وہ پس منظر ہے جہاں ماضی کی یاد محض جذباتی وابستگی نہیں رہتی بلکہ ایک شعوری اور فکری ردِ عمل کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ افسانہ نگار اس یاد کو اپنے کرداروں کے باطن میں اس طرح برتتا ہے کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی شناخت ثقافتی جڑوں اور انسانی وقار کی بازیافت کے لیے ایک خاموش مگر مسلسل مزاحمت کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ مزاحمت نعرہ یا تصادم نہیں بلکہ ایک تہذیبی احتجاج ہے جو شکست کے احساس کو معنویت میں بدل دیتا ہے۔ اس طرح اردو افسانہ ماضی کی بازیافت کو حال کے جبر کے خلاف ایک فکری ہتھیار بنا کر پیش کرتا ہے۔ اس حوالے سے قرۃ العین حیدر لکھتی ہیں:

> "ہم جہاں بھی رہیں ہم دنیا کے کسی بھی حصے میں چلے جائیں۔ وہ خطہ جس نے ہمیں جنم دیا ہے ہمیشہ ہمارا ذاتی معاملہ رہے گا۔ میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو اور ہمارا بیشتر ادب نوسٹیلجیا کا ادب ہے اور اس کی یہ خصوصیت ۱۹۴۷ء کے بعد بالکل لازمی اور جائز اور حق بجانب ہے۔"(12)

افسانہ نگار نے تقسیم کے بعد کی تہذیبی شکست اور داخلی خلا کو اردو افسانے میں محض ماضی کی یاد اور حسرت نہیں رہنے دیا بلکہ اسے مزاحمتی شعور میں ڈھال دیا اور اس وابستگی کو شناخت و قار اور تہذیبی بقا کے تحفظ کی علامت بنا کر جبر کے مقابل ایک خاموش مگر بامعنی احتجاج بنا کر پیش کیا ہے۔ اردو افسانے میں مزاحمتی علامت نگاری کو "سفید فاختہ اور آدمی" جیسے افسانوں میں افسانہ نگار نے فکری بالیدگی عطا کی جہاں خاموشی بھی جبر کے خلاف احتجاج بن جاتی ہے۔ یہ تخلیقات فرد کی داخلی شکستگی اور ضمیر کی بیداری کو نمایاں کرتی ہیں۔ اسی طرح عورت کی شناخت کو بھی مزاحمت کی علامت بنا کر پیش کیا گیا جو محض سماجی نہیں بلکہ سیاسی شعور کی نمائندہ ہے۔ افسانہ نگار کے ہاں ادب ایک متحرک قوت بن کر ابھرتا ہے جو ظلم ناانصافی اور جبر کے خلاف شعوری بیداری اور انسانی وقار کے تحفظ کا مؤثر ذریعہ بن جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

1. فتح محمد ملک، پروفیسر، "غلاموں کی غلامی" ، اشاعت اول، دوست پبلیکیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۲ء، ص ۲۰
2. طارق اسمعیل ساگر، "پاک بھارت تعلقات"۔۔۔۔ تاریخ اور تجزیہ اول، طاہر سنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۴۷
3. غلام حسین اظہر، ڈاکٹر، "اردو افسانہ پاکستان میں"، مطبوعہ اوراق، (مدیر، ڈاکٹر وزیر آغا)، ۱۹۸۱ء، ص ۴۳
4. فردوس انور قاضی، "افسانہ نگاری کے رجحانات"، بار دوم، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۴۶۰
5. جاوید احمد، "مزاحمتی ادب"، مشمولہ مزاحمتی ادب، ص 104
6. محمد جمیل "پگلی" افسانہ، مشمولہ "نوحہ بے نام" ص 301
7. منٹو، سعادت حسن، "جیب کفن"، یزید، اشاعت اول، مکتبہ جدید، لاہور، ۱۹۵۱ء، ص ۲۰۱
8. داؤد احمد، "مزاحمتی ادب"، مشمولہ مزاحمتی ادب، ص 108
9. جمال اختر، "سالگرہ کا کیک"، ایضاً، ص 96
10. ممتاز شیریں، "فسادات پر ہمارے افسانے"، معیار، ص ۲۲۰-۲۲۱
11. راہی اعجاز، "مزاحمتی ادب"، مشمولہ مزاحمتی ادب، ص 117
12. حیدر، قرۃ العین، "کیا موجودہ ادب روبہ زوال ہے"، مشمولہ، نقوش، فروغ اردو، لاہور، 1955، ص 1052

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

Roman Havalajat

1. Fateh Muhammad Malik, Professor, “Slaves of Slaves”, First Edition, Dost Publications, Islamabad, 2002, p. 20
2. Tariq Ismail Sagar, “India-Pakistan Relations”. History and Analysis I, Tahir Sons, Lahore, 2006, p. 74
3. Ghulam Hussain Azhar, Dr., “Urdu Afsana Mein Pakistan”, Printed Papers, (Editor, Dr. Wazir Agha), 1981, p. 43
4. Firdous Anwar Qazi, “Trends of Fiction”, second edition, Maktaba Aliya, Lahore, 1999, p. 460
5. Javed Ahmad, “Resistance Literature”, Contents of Resistance Literature, p. 104
6. Muhammed Jameel “Pugli” fiction, including “Noha Beynam” p.301
7. Minto, Saadat Hasan, “Jeeb Kafan”, Yazid, First Edition, Maktaba Jadidi, Lahore, 1951, p. 201
8. Dawood Ahmad, “Resistance Literature”, Content of Resistance Literature, p. 108
9. Jamal Akhtar, “The Birthday Cake”, ibid., p. 96
10. Mumtaz Shireen, “Our Myths on Riots”, Quality, pp. 220-221
11. Rahi Ejaz, “Resistance Literature”, Inclusive Resistance Literature, p. 117
12. Haider, Qarat-ul-Ain, “Is the current literature on the verge of decline? ”